
یہودیّت کا
تصوّرِ زمان و مکان
عبرانی صحائفِ مقدّسہ اور مروّجہ علوم کی روشنی میں



خدا کو ایک ماننے والے تین بڑے مذاہب یعنی یہودیت، مسیحیت اور اِسلام مغربی ایشیا کی سرزمین سے نکلے ہیں۔ یہودی مذہب اِن میں سب سے پُرانا ہے، لیکن یہ تمام دنیا میں نہ پھیل سکا۔ البتہ مسیحیت اور اِسلام، جو یہودیت کے بہت بعد میں آئے اور یہودیت ہی کے بنیادی اصولوں کو ترقی دیتے رہے، خود عالمگیر مذاہب بن گئے۔ دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا ملک یا ایسی نسل ہو گی، جس میں مسیحیت یا اسلام کے ماننے والے نہ پائے جاتے ہوں۔ اِن مذاہب نے بہت مدت سے انسانی دماغوں پر قبضہ کر رکھا ہے۔



یہودیوں کی تاریخ کتنی پرانی ہے، اِس کا ٹھیک اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ پھر بھی خیال کیا جاتا ہے کہ حضرت مسیح کی پیدائش سے کوئی ڈیڑھ دو ہزار برس پہلے اُن کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ خود یہودیوں کا یہ دعویٰ ہے کہ جب سے اِس دنیا کا وجود ہے، تب سے ہی وہ خدا کی محبوب اُمّت ہیں۔ خدا نے جو کچھ کِیا، وہ خاص طور پر اُنہی کی بھلائی کے لئے کِیا ہے۔ قدیم ترین یہودی، جنہیں عبرانی (Hebrews) بھی کہا جاتا ہے، شمالی عربستان کے خانہ بدوش تھے۔



بھیڑ بکریاں چرانا اُن کا پیشہ تھا۔ صدیوں تک وہ دجلہ و فرات کے بیابانوں اور کنعان میں اپنے گلّوں کو ساتھ لئے پھرتے رہے۔ رفتہ رفتہ بحرِ روم کے ساحل کے قریب اُن کی بستیاں بس گئیں اور وہ مختلف قبیلوں میں بٹ کر بنی اسرائیل کے نام سے مشہور ہو گئے۔ بنی اسرائیل کی تاریخ میں سب سے اہم زمانہ وہ تھا، جب مصر کے کسی فرعون نے عوامی عمارتیں تعمیر کرنے کا بڑے پیمانے پر منصوبہ بنایا، لیکن کام کرنے والوں کی کمی ہونے کی وجہ سے بنی اسرائیل کو غلام بنا کر مصر میں ڈال دِیا گیا۔



حضرت موسیٰ بھی بنی اسرائیل میں سے تھے، لیکن کسی مصری شہزادی نے اُن کو گود لے لیا۔ حضرت موسیٰ نے تقریباً 1300 قبل مسیح میں بنی اسرائیل کو مصری مظالم سے نجات دلائی۔ کہا جاتا ہے کہ موسیٰ نے ایک مصری کو قتل کر دیا تھا، جس کی وجہ سے اُنہیں مصر سے بھاگنا پڑا۔ اُنہیں مِدیان میں پناہ لینا پڑی، جہاں وہ ازدواجی زندگی گزارنے لگے۔ ایک دن جب وہ بھیڑ بکریاں چراتے ہوئے حورب کے پہاڑ یعنی کوہِ سینا یا کوہِ طور کے قریب پہنچے تو وہاں ایک جھاڑی میں بھڑکتی ہوئی آگ دیکھ کر اُنہیں یہواہ خدا کا عرفان حاصل ہوا۔



یہ وہی خدا تھا، جس کی موجودگی کو موسیٰ کے آباء و اجداد اپنی صحرا نوردیوں میں محسوس کِیا کرتے تھے۔ یہ دیوتا اُن قدیم عبرانیوں کے خیال میں نہ تو کوئی "شخص" تھا اور نہ ہی کوئی آسمانی "ستارہ" یا "سیّارہ" تھا۔ اُس کی عبادت کے لئے نہ تو اُنہوں نے کوئی مندر بنایا تھا اور نہ ہی پروہتوں کی کوئی ٹولی کھڑی کی تھی۔ وہ "یہواہ" کو ایک ناقابلِ بیان "عظمت" اور "قوّت" سمجھتے تھے۔ جب موسیٰ پر یہ ہستی ظاہر ہوئی تو اُس نے موسیٰ کو ہدایت دی کہ بنی اسرائیل کو مصر کی غلامی سے نجات دلائے، اور موسیٰ نے ایسا ہی کِیا۔



مصر سے خروج کے بعد بنی اسرائیل کے لئے یہ فرض قرار دیا گیا کہ وہ یہواہ خدا کو "واحد" مانیں اور اُس کے احکامات کی پیروی کریں۔ اِس کے بدلے میں یہواہ نے بنی اسرائیل کو اپنی مخصوص اور برگزیدہ اُمّت قرار دے کر اُنہیں اُن کے آبائی وطن میں آباد کرنے کا وعدہ کِیا۔ اسرائیلیوں کی تاریخ میں بڑے نشیب و فراز آئے۔ کبھی اُنہیں پے در پے شکستوں کا سامنا کرنا پڑا اور کبھی داؤد اور سلیمان کی بادشاہی میں امن و امان کا لطف بھی حاصل ہوا۔



حالات کے ساتھ ساتھ یہواہ کے متعلق اُن کے تخیّلات بھی بدلتے گئے۔ ایک دور میں وہ یہواہ کو "ربّ الافواج" یا "لشکروں کا خدا" سمجھتے تھے، جس کا کام اسرائیلیوں کو جنگ میں مدد دینا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ وہ اُسے "تمام جہانوں کا خدا" ماننے لگے، جبکہ خود کو ہمیشہ یہواہ کی "خاص اور چنیدہ قوم" ہی سمجھتے رہے۔ حالانکہ جب خدا تمام دنیا کا خدا قرار پایا تو پھر بنی اسرائیل کی تخصیص بھی قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ تاہم اِس کے باوجود وہ خود کو "باقی اقوامِ عالم سے منفرد" سمجھتے تھے۔



بنی اسرائیل نے تاریخِ عالم میں خود کو ہمیشہ اُسی وعدے کے تحت چنیدہ و برگزیدہ امت کے طور پر دیکھا، جو یہواہ نے موسیٰ سے کیا تھا۔ وہ اِس وعدے کو "میثاقِ موسیٰ" کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ بنی اسرائیل کا عقیدہ تھا کہ یہواہ نے عالم کو خلق کِیا اور انسان کو اشرف المخلوقات بنا کر دائمی مُسرّت کی زندگی گزارنے کے لئے باغِ جنّت میں رکھا۔ لیکن اوّلین انسان نے یہواہ کی نافرمانی کر کے باغِ جنّت کی دائمی زندگی کو کھو دِیا اور خود کو احساسِ گناہ اور مصائب میں مبتلا کر لیا۔



یہیں سے باقاعدہ انسانی زندگی کی تاریخ کا آغاز ہوتا ہے۔ یہواہ ابتدا ہی سے انسان کو اُس کی کھوئی ہوئی مُسرّت اور مقام دِلانے کا خواہش مند ہے۔ اِسی بنیاد پر اُس نے تاریخی واقعات کا رُخ متعیّن کِیا۔ اسرائیلیوں کے نزدیک تاریخِ انسانی خدا کے خاص منصوبے کے تحت آگے بڑھ رہی ہے اور تمام تاریخی واقعات بالآخر ایک ایسے وقت پر اختتام پذیر ہوں گے، جو یہواہ کے منصوبے کی تکمیل کا حصہ ہے۔



اسرائیلی کتبِ مقدسہ کو "پُرانا عہد نامہ" کہا جاتا ہے، جو 39 کتابوں پر مشتمل ہے اور اس کی پہلی پانچ کتابیں "توراۃ" یا "اسفارِ خمسہ" کہلاتی ہیں۔ توراۃ کے ابتدائی بیانات میں تخلیقِ عالم کی تفصیل دی گئی ہے اور اس کے بعد بنی اسرائیل کی تخصیص جیسے واقعات کا بیان پایا جاتا ہے، جسے بنی اسرائیل کی قومی تاریخ کا آغاز بھی کہا جاتا ہے۔ گویا کہ بنی اسرائیل یہ سمجھتے رہے کہ کائنات کی تخلیق میں اسرائیلیوں کو ایک ممتاز مقام اور فضیلت حاصل ہے۔



ایک طویل عرصے تک بنی اسرائیل اچھے دنوں کی امید کرتے رہے۔ لیکن جب اُن کی عالمگیر حکومت قائم نہ ہوئی تو یہ خیال ابھرا کہ وہ یہواہ کی اطاعت میں کوتاہی کر رہے ہیں۔ اِس خیال کے ساتھ ہی بنی اسرائیل میں یہ عقیدہ قائم ہونے لگا کہ جب نافرمانی اور گناہ انتہا کو پہنچ جائیں گے تو ایک "مسیح" یا "مسیحا" کا ظہور ہو گا، جو ایک "فوجی راہنما" ہو گا اور بنی اسرائیل کے دشمنوں کا صفایا کر دے گا، یا وہ ایک مافوق الانسان ہو گا، جو اِس پرانی دنیا کو بدی سے پاک کرنے کے لئے از سرِ نَو ترتیب و تشکیل دے گا۔ یہی "یومِ آخر" یا "یہواہ کا دن" ہو گا۔



اِس طرح بنی اسرائیل کے نزدیک نظامِ کائنات، تاریخِ انسانی اور سلسلہِ زمانی ایک ہی فلسفے کے بنیادی عناصر ہیں۔ اِن سب کی ابتدا تخلیقِ عالم سے ہوئی اور انتہا "یہواہ کے دن" پر ہو گی۔ جبکہ درمیان کا عرصہ "دورِ زمانی" ہے۔ اِس عرصے میں جو کچھ ہوتا ہے، وہ یہواہ خدا کی "مشیّت" سے ہوتا ہے۔ وہی روشنی کا مُوجد اور تاریکی کا خالق ہے۔ وہی سلامتی کا بانی ہے اور بلا کا پیدا کرنے والا ہے۔



اُس نے کچھ اصول مقرر کر دیئے ہیں اور نظامِ عالم اُنہی اصولوں پر چل رہا ہے۔ یہواہ قادرِ مطلق ہے۔ وہ جب چاہے نظامِ عالم میں دخل دے سکتا ہے، لیکن اُس نے بنی اسرائیل سے وعدہ کِیا ہے کہ "یہواہ کے دن" سے پہلے اِس نظام میں کوئی تبدیلی نہیں کی جائے گی۔ وہ دن کب آئے گا، یہ صرف خدا کو ہی معلوم ہے۔ اُس کا علم انسان کی عقل سے باہر ہے۔ لیکن وہ دن آئے گا ضرور، اور انسانوں کو چاہیئے کہ وہ نہ صرف اُس دن کی تیاری کریں، بلکہ اِلٰہی شریعت کی تعمیل بھی کریں۔



اِس فلسفے میں مابعد الطبیعیاتی مسئلوں اور مظاہر کی تشریحات پر زور نہیں دیا جاتا۔ اس کے باوجود یہ فلسفہ مذہبی اعتقادات سے مکمل طور پر مطابقت رکھتا ہے اور الٰہیاتی نقطۂِ نظر سے ماضی اور مستقبل دونوں کو سمجھا جا سکتا ہے۔ فرینکفرٹ (Frankfurt) نے کہا تھا: "یہ کہنا غلط ہو گا کہ یہ سب خیالات کسی گھمبیر سوچ بچار کے بعد نکلے تھے"۔ یہ حل "قلبی واردات" کی بنیاد پر نکالا گیا ہے اور جن کا مذہب اطاعت پسندی پر مبنی ہو، اُن کی تشفی کے لئے کافی ہے۔



توراۃ کے مطابق یہواہ نے زمین، آسمان، جمادات، حیوانات اور انسان کو چھ دنوں میں خلق کِیا۔ عہد نامہِ قدیم کے ایک صحیفے میں اِس کی تفصیل دی گئی ہے کہ "یہواہ نے سمندر کو چِلّو سے ناپا اور آسمان کی پیمایش بالشت سے کی اور زمین کی گرد کو پیمانے میں بھرا اور پہاڑوں کو پلڑوں میں وزن کِیا اور ٹیلوں کو ترازو میں تولا"۔ لیکن یہاں اِس سوال کا کوئی جواب نہیں ملتا کہ آیا عالم پہلے سے ہی مادّے کی شکل میں موجود تھا اور یہواہ نے اِس کو محض ایک نئ شکل عطا کی؟ یا اُس نے عالم کو عدم سے خلق کِیا؟



حقیقت تو یہ ہے کہ اِس قسم کا سوال عبرانیوں کے دماغ میں اُٹھ ہی نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ جیسے جان میکنزی (John McKenzi) نے کہا ہے: "عدم سے تخلیق کا نظریہ، جو آج کل کی اِلٰہیات میں پڑھایا جاتا ہے، اُس کے لئے ایک ایسے فلسفۂ کائنات کی ضرورت ہے، جس کا علم عبرانیوں کو نہیں تھا"۔ توراۃ میں تخلیق کے تصور کے متعلق دعویٰ نہیں ہے کہ اُس سے کائنات کے وجود کا بھید کھلتا ہے۔ یہ تو بقولِ جولیس گتمان: "محض ایک شکل نکالی گئی ہے، جس سے انسان کے مذہبی شعور اور خدا کا رشتہ واضح ہو کر سامنے آجائے"۔



عبرانی عقائد کا بنیادی مفروضہ یہ تھا کہ یہواہ قادرِ مطلق ہمیشہ سے موجود ہے۔ اُسی نے عالم کو خلق کِیا اور اُس کی مرضی ہی "عِلّتِ عالم" ہے۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ ہر نظریے یا عقیدے کی بنیاد کسی نہ کسی مفروضے پر ہوتی ہے، جسے ہمیشہ ثابت کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ لیکن دوسری طرف یونانیوں کا نظریہ بھی پھیل رہا تھا کہ جب تک کوئی بات عقل کی کسوٹی پر پوری نہ اُترے، اُسے صحیح نہیں ماننا چاہیئے۔ اِس سلسلے میں یہودی علماء نے یہ حل نکالا کہ عقل خود یہواہ پر ایمان کے وسیلے سے حاصل کی جا سکتی ہے۔



لٰہذا کچھ علماء تو "عہد نامہِ قدیم" کی حرف بہ حرف لفظی تفسیر
کرتے تھے اور کچھ علماء اِس کو تاویل کر کے فلسفے سے ملا دینا چاہتے
تھے۔ مثلاً پہلی صدی قبل مسیح میں اسکندریہ کے ایک یہودی مفکر
فائلو نے "کُتبِ مُقدّسہ میں استعارے" تصنیف کی۔ اِس کتاب نے
یہودیوں کے عقائد پر زبردست اثر ڈالا۔ اِس میں کہا گیا ہے کہ "عہد
نامہِ قدیم" میں زبان تو داستانوں کی سی ہے، لیکن حقیقتاً اِس میں فلسفیانہ
نظریات گھما پھرا کر پیش کئے گئے ہیں۔ چھ دنوں میں تخلیق کی تاویل
فائلو نے یوں کی:



"یہ سوچنا بڑا ہی بھولا پن ہو گا کہ دنیا چھ دنوں میں بنی یا تخلیق "زمان" کے اندر ہوئی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ "زمان" دن رات کے تواتر کے علاوہ کچھ نہیں۔ یہ تواتر نیچے زمین اور اوپر سورج کی گردش سے پیدا ہوتا ہے۔ زمان کی ماہیت آسمان کی گردش سے ہی متعین ہوتی ہے۔ تورات کا یہ ارشاد کہ "عالم چھ دنوں میں بنا"، گنتی کے چھ دنوں پر زور نہیں دیتا۔ اِس اشاراتی زبان میں یہ بتایا گیا ہے کہ یہواہ کی صناعی کامل ہے اور عالم کی تخلیق کامل ہوئی، کیونکہ "چھ کامل عدد" ہے۔ یہ دلیل یونانی ریاضی دان فیثاغورث کے فلسفے کے عین مطابق ہے۔



فیثا غورث کا نظریہ تھا کہ "ہر شئے عدد ہے" اور "ہر عدد کی مخصوص رمزی خصوصیات ہوتی ہیں"۔ اِسی بنیاد پر مختلف مسئلوں کو سمجھایا جا سکتا ہے۔ چھ چونکہ اپنے اجزائے ضربی کا مجموعہ ہے، اس لئے اِسے "کامل عدد" مانتے ہیں۔ عہد نامہِ قدیم میں بھی یہ عدد کاملیت ظاہر کرنے کے لئے ہی استعمال ہوا ہے"۔



صدیوں تک یہودی علماء کو تخلیق کے متعلق مابعد الطبیعیاتی اور منطقی اُلجھنیں محسوس نہیں ہوئیں۔ لیکن بارہویں اور تیرہویں صدی عیسوی کے آتے ہی یہ سوالات خاص طور سے پوچھے جانے لگے کہ "کیا زمان کا کوئی ذاتی وجود ہے؟"، "کیا تخلیق سے پہلے زمان کا وجود تھا یا نہیں؟" اور "کیا کائنات ہمیشہ سے ہے؟" یہودی علماء اِن سوالوں کے جوابات دینے میں یونانی فلسفیوں سے بچ نہیں سکتے تھے، خصوصاً جب کہ اُس زمانے میں مُسلم علماء اور اُن کے پیشرَو اُن فلسفیوں کو اپنی اِلٰہیات میں ملانے کی کوشش کر رہے تھے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ یہودی علماء اِس بات پر تو متفق ہو گئے کہ عالم کا وجود یہواہ کی مشیّت سے ہے، لیکن بقیہ سوالوں پر کسی قسم کا متفقہ نظریہ یا عقیدہ بننا ممکن نہ تھا۔ مثلاً موسیٰ بن میمون (1135ء تا 1204ء) نے ارسطو کے اِس نظریے کو مان لیا کہ زمان محض "عدد" ہے، جس کی بنیاد پر "پہلے" سے "بعد" تک کی حرکت کا پتا چلتا ہے۔ اِس لئے زمان کا ذاتی وجود نہیں۔ وہ "حرکت" بھی نہیں، کیونکہ حرکت خود ایک "حادثہ" ہے، جو مادّی چیزوں یا اجسام کے ساتھ پیش آتا ہے۔ لٰہذا زمان کو "حادثے کا حادثہ" سمجھنا چاہیئے۔





یہ دو اجزاء یعنی "ماضی" اور "مستقبل" پر منحصر ہے۔ ماضی تو
چلا گیا اور مستقبل کا ابھی وجود نہیں۔ حال ہی دونوں کے درمیان جاری
ہے۔ اِس معنی میں زمان کو "نیم حقیقی" کہہ سکتے ہیں۔ ارسطو کا عقیدہ تھا
کہ زمان کی ماہیت سے ہی کائنات کے ازلی و ابدی ہونے کا ثبوت مل
سکتا ہے۔ ابنِ میمون کے خیال میں یہ مفروضہ غلط ہے۔ زمان کا وجود تو
کائنات کی تخلیق کے موقع پر ہوا۔ اِس سے پہلے "یہواہ کی لازمان
ابدیت" ہی تھی۔ کیونکہ یہواہ ہی مُطلق غیر مادّی ہے اور حرکت سے
آزاد ہے۔



ابنِ میمون نے یہ بھی کہا کہ اگر یہ مان بھی لیں کہ عالم ہمیشہ سے موجود ہے، تب بھی یہواہ کی ابدیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اہمیت صرف "مشیّت" کی ہے۔ تخلیق خواہ "عدم" سے ہی کیوں نہ ہوئی ہو، لیکن اِس کا انحصار "یہواہ کی مشیّت" پر ہی ہو گا"۔



ابنِ میمون کے برخلاف حسدمی کرسکس (1340ء تا 1400ء) کا خیال ہے "زمان" حرکت کا حادثہ نہیں ہے۔ یہ حقیقت میں "ایک باشعور دماغ" کے دھارے کا "دَوران" یا "تسلسل" ہے۔ دو لمحوں کے درمیانی وقفے میں کتنی حرکت ہوتی ہے؟ اِسی سے زمان کی "مقدار" یا "ناپ" کا پتا چلتا ہے۔ لہٰذا زمان کا انحصار حرکت پر نہیں۔ اِس کا وجود "دَوران" کی حیثیت سے ہے۔ اِس کے علاوہ وہ دماغ کی سرگرمی کا "دوران" بھی ہے۔ اِس لئے اِس کا وجود ذہن کے باہر نہیں ہے۔



ابنِ میمون کے برخلاف حسدمی کرسکس (1340ء تا 1400ء) کا
خیال ہے کہ "زمان حرکت کا حادثہ نہیں"۔ یہ حقیقت میں "ایک با
شعور دماغ" کے دھارے کا "دَوران" یا "تسلسل" ہے۔ دو لمحوں کے
درمیانی وقفے میں کتنی حرکت ہوتی ہے؟ اِسی سے زمان کی "مقدار" یا
"ناپ" کا پتا چلتا ہے۔ لہٰذا زمان کا انحصار حرکت پر نہیں۔ اِس کا وجود
"دَوران" کی حیثیت سے ہے۔ اِس کے علاوہ وہ دماغ کی سرگرمی کا
دوران بھی ہے۔ اِس لئے اِس کا وجود ذہن کے باہر نہیں ہے۔



اِس سے کرسکس نے یہ نتیجہ نکالا کہ زمان کا وجود "نیم حقیقی" بھی نہیں ہے۔ زمان کا تعلق دَوران سے ہے اور دوران کا تعلق دماغ سے ہے، جسم یا مادّے سے نہیں۔ لٰہذا زمان کو یہواہ جیسی ہستی سے ہی، جو مطلق غیر مادّی ہے، وابستہ کر سکتے ہیں۔ اِس معنی میں زمان ہمیشہ سے ہے۔ تخلیق سے پہلے وہ "یہواہ کی لامتناہی شعوریت کے اندر" موجود تھا۔ اِسی نظریہ کو ایک دوسرے یہودی مفکر نے آگے بڑھایا اور کہا کہ "حقیقی زمان عالم کی تخلیق سے پہلے نہیں تھا"۔



جب چاند، سورج اور دوسرے سیارے بن چکے تو حرکت بھی
شروع ہوئی اور "دَوران" یا "وقفہ" کی ناپ کا امکان ہوا۔ تب سے
"حقیقی زمان" کا وجود سمجھنا چاہیئے۔ یہودی عقائد میں اِسی قسم کے
نظریات "مکان" کے متعلق بھی ملتے ہیں۔



ابتدا میں عبرانی لفظ "مقوم" (عربی میں "مقام")، "مقامِ قدّوس" یا "سکینہ" کے لئے استعمال ہوتا تھا، جس کے معنی ہیں، "پاک" یا "متبرّک جگہ"۔ لیکن رفتہ رفتہ "مقوم" کو یہواہ کا لقب سمجھا جانے لگا۔ عہد نامہِ قدیم میں کہا گیا ہے کہ "یہواہ ابد الآباد سے ہمارا مسکن رہا ہے"۔ اِس سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ عالم یہواہ کا مسکن نہیں، بلکہ یہواہ عالم کا مسکن ہے۔

میکس جیمز کا خیال ہے کہ یہ محض استعارہ نہیں، بلکہ طویل عرصے کی الٰہیاتی فکر کا نتیجہ ہے۔ اِس نظریے کی بنیاد یہ ہے کہ یہواہ ہر جگہ موجود یا "حاضرِ مطلق" ہے۔ مثلاً عہد نامہِ قدیم کے مطابق "وہی خدا آسمان کے اوپر ہے اور وہی زمین کے نیچے ہے۔ اُس کے علاوہ کوئی نہیں"۔ اِس تصوّر سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا تھا کہ خدا ہر شئے کے اندر جلوہ گر ہے۔ لیکن یہودی مفکرین نے یہ رائے قائم کی کہ یہواہ خود "مقوم" یا "مکان" ہے۔



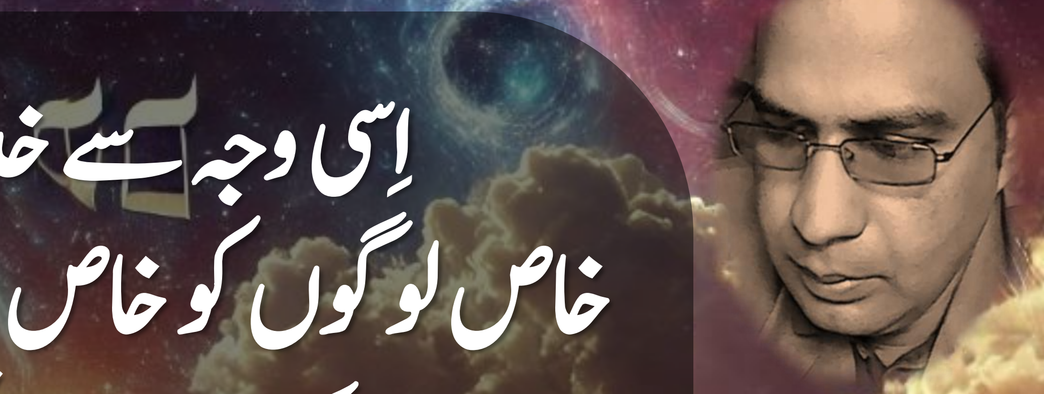
پہلی صدی قبل مسیح میں فائلو نے اِس کی مزید تشریح یوں کی کہ
موجودات "مقام" کے اندر ہوتے ہیں اور چونکہ یہواہ تمام چیزوں کا
احاطہ کئے ہوئے ہے، اور کوئی شئے اُس کو اپنے اندر نہیں لے سکتی، لہٰذا
یہواہ خود اپنا ہی مقام ہو گا۔



ابنِ میمون نے ارسطو کے "طبیعی نظریہ مکان" کو مان لیا۔ اِس طور پر اُس کے خیال میں "خصوصی مکان" اور "عمومی مکان" میں فرق ہے۔ خصوصی مکان الگ الگ اجسام کا مقام ہوتا ہے اور عمومی مکان تمام اجسام کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے، جس میں ساتوں آسمان بھی شامل ہیں۔ چونکہ کائنات محدود ہے، لہٰذا مکانِ عمومی بھی محدود ہے۔



اپنی تصنیف "دلالۃ الحیرتیین" میں اُس نے کہا ہے کہ خدا کا ہر نام یا لقب اُس کے کسی مخصوص عمل سے وابستہ ہوتا ہے۔ صحیفۂ زکریاہ کے مطابق "یومِ آخر پر خدا ایک ہوگا اور اُس کا نام بھی ایک ہوگا" اور ایک دوسرا صحیفہ بتاتا ہے کہ "تخلیق سے پہلے وہ تھا اور اُس کا ایک نام تھا"۔ اِن بیانات سے نتیجہ نکلتا ہے کہ خدا کے تمام نام تخلیق کے مختلف پہلوؤں سے نکلتے ہیں۔ صرف "یہواہ" کا لفظ اُس کی وجودیت کو ظاہر کرتا ہے، کسی دوسری صفت کو نہیں۔ اُس کی وجودیت کو سمجھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔



اِسی وجہ سے خدا کا یہ مخصوص نام یا "اسمِ اعظم" صرف کچھ
خاص لوگوں کو خاص موقعوں پر لینے کی اجازت ہے۔ لیکن اِس کو
"مقوم" کے نام سے یاد کر سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ لفظ اُس کی وجودیت کے
درجے کی طرف اشارہ کرتا ہے، جس طرح روزمرہ کی بول چال میں یہ
کہتے ہیں کہ "علم میں فلاں نے اپنے باپ کا مقام لے لیا"۔ اِس کا
مطلب یہ ہوتا ہے کہ علم میں فلاں کا درجہ وہی ہے، جو اُس کے باپ کا
تھا۔ اِس طرح یہواہ کو "مقوم" یا "خود اپنا مقام" کہنے سے مراد یہ ہے
کہ "کوئی دوسرا درجہ اُس کے مشابہ نہیں"۔



ابنِ میمون کے علاوہ حسدمی کرسکس نے اِس کی تاویل یوں کی ہے کہ یہواہ کو "مقوم" کہنے کا مطلب محض یہ ہے کہ عالم اُس کی "ظاہری شکل" ہے۔ اِن تشریحات کے علاوہ یہواہ کو "مقوم" ثابت کرنے کے لئے ایک قسم کے علم الاعداد سے بھی دلیل دی جاتی تھی۔ یہ علم، جسے یونانی زبان میں "گماتریا" (Geometry) کہتے ہیں، یونان میں ایجاد ہوا۔ اِس اصول میں یہ مانتے ہیں کہ کسی شئے کی خصوصیات کا پتا اُس کے نام سے لگایا جاسکتا ہے۔



اِس علم میں ہر حرف کی مخصوص عددی قیمت مان لیتے ہیں۔
عربی اور عبرانی زبانوں میں یہ علم "علم الابجد" کہلاتا ہے، جسے اردو کے
شعراء تاریخ گوئی کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ چونکہ کچھ یہودی علماء کو
اِس سے یہ ثبوت مل گیا کہ "یہواہ" اور "مقوم" ایک ہی ہیں، اِس
دلیل پر موجودہ زمانے کی منطق کی کسوٹی لگانا تو مناسب نہیں۔ لیکن یہ
تو "گماتریا" کے قواعد کو بھی پورا نہیں کرتی، کیونکہ لفظ "مقوم" کے
حروف کی عددی قیمت سیدھے سیدھے جوڑ دی گئی ہے۔ لیکن لفظ
"یہواہ" کے حروف کی عددی قیمتوں کے مربعے جوڑے گئے ہیں۔



یوں تو "یہواہ" کی عددی قیمت 26 ہے اور "مقوم" کی 186،
اِس کے معنی یہ ہوئے کہ یہواہ کو مقوم کے اندر شامل سمجھنا چاہئے۔
کیونکہ 26 کا سات گُنا بھی 186 سے کم ہے۔ یہ نتیجہ یہودیوں کے
الہٰیاتی عقائد کے خلاف ہوتا، کیونکہ خدا کی لامکانیت ختم ہو جاتی۔ لیکن
اِس دلیل کی منطقی خامی کے باوجود اہمیت اِس بات کی ہے کہ الہٰیاتی
طور پر یہواہ اور مقوم کو ایک ہی ثابت کرنے کے لئے گماتریا کے
اصولوں میں ترمیم کرنے میں تکلّف نہیں ہوا۔


ختم شُد